پس عکس خیال
(انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے)
اسد صدیقی

مصنّف و مترجم ــــ ارشد صدّیقی

غیر زبان کی نظموں کا ترجمہ کرنا اور وہ بھی نظم میں، آسان کام نہیں، لیکن جناب ارشد صدّیقی نے اِس مشکل منزل کو جس آسانی سے طے کیا ہے اس کو دیکھ کر اُن کی سخنورانہ اہلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

لکھنؤ، سنہ ۱۹۵۶ء — نیاز فتحپوری

پسِ عکسِ خیال

(انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے)

ارشد صدیقی

ناشر

مکتبۂ دانش کدہ بھوپال

تصنیف	:	"پسِ عکسِ خیال"
		(انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے)
مترجم و مصنّف	:	ارشدؔ صدیقی
ناشر	:	مکتبۂ دانشکدہ بھوپال
کمپوزنگ	:	ارم کمپیوٹرس بھوپال
طباعت	:	شبد پرنٹرس بھوپال
معاونت	:	نصیر پرواز
تعداد	:	پانچ سو (پہلی بار)
زرِ تعاون	:	سو روپۓ
تاریخِ اشاعت	:	۲۰۰۰ء

ملنے کے پتے

۱۔ دانش کدہ سی / ۲۳ باغ امراؤ دولھا بھوپال ۱۰

۲۔ بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال

۳۔ مکتبۂ شرقیہ، ابراہیم پورہ، بھوپال

(اس تصنیف پر کسی اکادمی یا ادارے سے کوئی مالی تعاون حاصل نہیں کیا گیا)

اِنتساب

ملک کے علمی وادبی رہنما.......

مولانا ابو الکلام آزاد (مرحوم) کے نام!

جن کے مفید مشوروں نے منظوم تراجم کے سلسلے میں

میری رہنمائی فرمائی

ارشدؔ صدیقی

تعارف

نام	:	رشید محمد
تخلص	:	ارشد صدیقی
ولدیت	:	جناب نور محمد صاحب (مرحوم)
تاریخِ پیدائش	:	۱۹ مارچ ۱۹۲۳ عیسوی
مقام	:	ساگر (مدھیہ پردیش)
تعلیم	:	ایم اے (پرشین)۔ گولڈ میڈلسٹ (انٹر سے ایم اے تک فرسٹ کلاس فرسٹ گولڈ میڈلسٹ)
پیشہ	:	سرکاری ملازمت (۱۹۸۰ء میں پینشن پر سبکدوش)
آغازِ شاعری	:	۱۹۴۱ء
تلمیذ	:	حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی
اعزازات	:	مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال سے ۹۵-۱۹۹۴ء کا "سراج میر خاں سحر صوبائی ایوارڈ" برائے تخلیقی شاعری

تصانیف :

۱۔ "عکسِ خیال" ۱۹۵۷ء

۲۔ "خواب زار" ۱۹۸۵ء

۳۔ "نوائے حرف" ۲۰۰۰ء

۴۔ "نغمہ زار" ۲۰۰۰ء

۵۔ "طلوعِ سحر" ۲۰۰۰ء

۶۔ "عنواناتِ درخشاں" ۲۰۰۰ء

۷۔ "پسِ عکسِ خیال" ۲۰۰۰ء

تصانیف زیرِ ترتیب

۱۔ "بساطِ فکر و نظر" (رسمی منظوم تخلیقات)

۲۔ "عمل، ردِ عمل" (نثری مضامین و مقالات)

مشاغل

- ملک میں منعقدہ آل انڈیا اور انڈو پاک مشاعروں میں شرکت
- ہندوپاک کے مقتدر رسائل میں کلام کی اشاعت
- آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے ۱۹۵۶ء سے منسلک۔
- دوردرشن بھوپال کے متعدد پروگراموں میں شرکت مثلاً "سرساز اور آواز" پرسنل انٹرویو، شعری وادبی گفتگو اور مکالمے اور دوردرشن کے ذریعہ منعقدہ مقامی، صوبائی وکل ہند مشاعروں میں شرکت۔
- اردو زبان وادب سے متعلق گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ درجات کے طلباء وطالبات کی تعلیم وتدریس اور ایم اے وپی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالوں کی تیاری میں معاونت ورہبری

رہائش :

سی / ۶۳۔ باغ امراؤ دولھا کالونی بھوپال 462010

فون نمبر (0755)750649

فہرست

نظمیں

"عکسِ خیال"

اضافہ

حرفِ اوّل

"پسِ عکسِ خیال" محترم ارشد صدیقی صاحب کا ترمیم شدہ اور اضافہ شدہ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم پر مشتمل وہ مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۵۷ء میں ان کی پہلی کتاب کی شکل میں "عکسِ خیال" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت اس کتاب میں صرف پندرہ ۱۵ نظموں کے تراجم شامل تھے۔ آج جب یہ کتاب نئی آب و تاب کے ساتھ شائع کی جارہی ہے تو اس میں دس نئی نظموں کا اضافہ کردیا گیا ہے پرانی نظموں میں چند جگہوں پر نہایت خفیف اور مناسب ترمیم بھی کی گئی ہے اور یہ ترمیم محض اس سبب سے کی گئی ہے کہ ایسا کرنا ناگزیر سا ہو گیا تھا اس سے نہ تو اس نظم کے مرکزی خیال پر کوئی اثر پڑا ہے اور نہ مصرعہ کی ساخت اور مفہوم پر کوئی حرف آیا ہے بلکہ میری رائے میں یہ تبدیلی تو تبدیلی کے زمرے میں بھی نہیں آتی۔ دس نظموں کے اضافے کے بعد "پسِ عکسِ خیال" دراصل "عکسِ خیال" کا عکس نظر نہیں آتا بلکہ ایک نئی تصنیف محسوس ہوتی ہے۔ ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کی فراہمی نے اشاعت کی دشواریوں کو جو آسانیاں بہم پہنچائی ہیں اس سے کتابوں کے گیٹ اپ اور دیدہ زیبی پر بھی اچھا اثر پڑا ہے۔ کچھ اس لئے بھی یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ جہاں ان کی چار دیگر کتابیں ایک ساتھ اشاعت پزیر ہورہی ہیں وہیں انکی پانچویں کتاب بھی نئی آب و تاب کے ساتھ شائع کی جائے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع ہے جب کسی مصنّف کی پانچ کتابیں کسی سرکاری ادارے، اکادمی، یا کسی اور ذرائع کی مدد کے بغیر ایک ساتھ شائع ہورہی ہیں۔

ارشد صاحب کو اس حقیقت اور صورت حال کا پورا پورا علم ہے کہ یہ ساری کتابیں "نذرِ خلوص" اور "شکریئے" کے زبانی توصیف نامے سے سرفراز ہونے والی ہیں پھر بھی وہ اس کے تمام مصارف ذاتی طور پر برداشت کررہے ہیں اور اردو زبان و ادب کے سچّے خدمت گار کی شکل میں خود کو پیش کرنے کی سعادت حاصل

کر رہے ہیں ورنہ اس دور میں اردو کے نام پر اپنی جیبیں اور پیٹ بھرنے والے تو بہت ملیں گے ایک کتاب اور رسالے کو خرید کر پڑھنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، کہ اتنے بڑے ملک میں اتنے اردو کے نام لیواؤں کے درمیان ارشد صدیقی جیسا کوئی سرفروش نکل آئے جو اردو کیلئے بہر نوعیت اور بہر صورت اتنا کچھ کرنے کو تیار ہو۔

"عکسِ خیال" جیساکہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ اُسی عرصے میں ارشد صاحب میٹرک، انٹر اور بی اے کے طالب علموں کو ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ دیگر مضامین کے علاوہ اُس زمانے میں جنرل انگلش لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھی جو انگریزی کے مختلف پہلوؤں پر محیط تھی نثر کے علاوہ انگریزی کی چند مشہور نظمیں بھی نصاب میں شامل تھیں جو انگریزی کے مستند اور قابلِ ذکر شعراء کی تھیں۔ چونکہ یہ نظمیں نصاب میں شامل تھیں اس لئے انتخاب اور ترتیب دینے والوں نے طالب علموں کے ذہنی اور شعوری معیار کو نگاہ میں رکھ کر انہیں شاملِ نصاب کیا تھا۔ ارشد صاحب نے ٹیوشن کی ذمہ داری تو بہر حال پوری کر دی لیکن نہ معلوم وہ کون سا لمحہ تھا جب ان کے اندر ان نظموں کے منظوم ترجمے کا خیال آیا اور پھر اس خیال نے عملی شکل بھی اختیار کر لی، نظموں کے انتخاب میں انہیں کوئی کاوش بھی نہیں کرنی پڑی بلکہ وہ ساری نظمیں دائرۂ انتخاب میں آگئیں جو ان دنوں میں عام طور پر نصاب میں شامل تھیں۔ چونکہ ترجمے کا بنیادی مقصد بھی درس و تدریس تھا اس لئے ارشد صاحب نے لفظی ترجمے کی پابندی اپنے اوپر عائد کر لی دوسری اہم بات یہ بھی ہوئی کہ ارشد صاحب نے نظموں کا ترجمہ کرتے وقت بحر اور آہنگ کی پابندیوں کا احترام بھی کیا، کہیں کہیں تو وہ اس سے بھی تجاوز کر کے ردیف اور قافیے کی پابندیوں تک آگئے۔

وہ تمام اہلِ قلم جو ترجموں کی سخت راہوں سے گذرے ہیں جانتے ہیں کہ یہ راستہ کتنا دشوار ہے، انگریزی یوں بھی بہت وسیع اور مالدار زبان ہے جانے کب سے اسے بین الاقوامی زبان ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں اردو کی کیا حیثیت ہے، یوں بھی ہر زبان اپنی جگہ ایک تہذیب کا درجہ رکھتی ہے۔ ہر

قوم کی زبان اس کی معاشرتی اور تمدنی اقدار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ وہ الفاظ جو عام طور پر بول چال میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں اپنے اندر ایک خاص حُسن پیدا کر لیتے ہیں جو خاص جذبات و احساسات کی تفسیر و تشریح کرتے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت سب سے دشوار ترین مرحلہ یہ ہے کہ ان لفظوں کے مساوی دوسری زبان میں وہ لفظ اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا جو اس کی روح کو فی نفسہٖ بیان کر دے۔

مترجم جب دونوں زبانوں کے کلچر اور تہذیب سے واقف ہوتا ہے تو ترجمہ کرتے وقت لغوی معنی کو دوسری زبان سے ہم آہنگ کر کے کماحقہٗ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ لیکن جو حضرات ان لفظوں کے مزاج اور کیفیت سے واقف ہوتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ترجمے کے بعد وہ فضا وہ کیفیت اور وہ تاثر قائم نہیں رہ پاتا جو اصل نظم کا خاصہ ہے اور شاید اسی لئے اردو ترجموں کی کمی واضح طور پر کھٹکتی ہے پھر ترجمے کی شکلیں بھی مختلف ہیں بعض اوقات لفظی ترجمے کو اہمیت دی جاتی ہے اس سے تاثراتی فضا برقرار نہیں رہ پاتی لیکن ترجمے کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ لفظی ترجمے کے بجائے سطری ترجمے پر ترجیح دیتے ہیں یا پورے Stanza یا پورے بند کے مضمون کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح کسی حد تک مضمون اور تاثر کی صحت برقرار رہتی ہے لیکن لفظ بدل جاتے ہیں۔ تیسری ترجمے کی شکل یہ ہوتی ہے پوری نظم کے مرکزی خیال کو بنیاد بنا کر اپنی زبان اپنے جذبات اور اپنے تاثرات کا خاکہ بُن لیا جاتا ہے اور آخر میں یہ نوٹ لگا دیا جاتا ہے کہ مرکزی خیال انگریزی سے ماخوذ۔ معلوم نہیں اہلِ علم نے کس ترجمے کو معیارِ فن مانا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ لفظی ترجمہ جہاں تک نبھایا جا سکے ضرور نبھایا جانا چاہئے۔ لیکن ساخت، ہیئت، نفسِ مضمون اور معنویت کا پورا پورا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ لفظی ترجمے کی وجہ سے اگر نظم کے مرکزی تاثر پر آنچ آتی ہے تو اسی قبیل کا دوسرا لفظ استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونا چاہئے۔ ''عکسِ خیال'' میں ارشد صاحب نے لفظی ترجمے پر زیادہ توجہ دی ہے تاہم اپنی قادر الکلامی اور فنی مہارت کے سبب ان لفظوں کے تاثراتی پہلو کو بھی برقرار رکھا ہے۔ وہ اگر چاہتے تو ان نظموں کا ترجمہ آزاد نظموں کی صورت میں

کر سکتے تھے اس سے زیادہ تن آسانی کی صورت یہ بھی تھی کہ موجودہ روِش کے مطابق نثری نظموں کی شکل میں ترجمے پیش کر دئے جاتے۔ ان کی اس کاوش کو بھی بہ نگاہِ استحسان دیکھا جاتا لیکن ان کی شاعرانہ فطرت اور شعر گوئی پر مہارت اور دسترس نے انہیں خود چند پابندیوں میں باندھ لیا۔ اگر ان نظموں پر یہ نہ لکھا جائے کہ یہ منظوم ترجمہ ہیں تو بعض نظمیں بالکل طبع زاد معلوم ہوتی ہیں۔

"پس عکسِ خیال" میں جن دس نظموں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں ارشد صاحب نے لفظی ترجمے پر اپنی گرفت تھوڑی کم کر دی ہے بلکہ Stanza wise قطعہ بند مفہوم اور معنی پر زیادہ توجہ دی ہے اس لئے نظمیں اگرچہ ہیئت کے اعتبار سے بدلی ہوئی نظر آتی ہیں مگر تاثر کے اعتبار سے بھرپور ہیں۔ یہاں جہاں نظم کا تخلیق کار بولتا ہے وہیں ارشد صاحب کے لہجے کی نرمی اور جذبے کی صداقت بھی اس میں رنگ آمیزی کرتی ہے۔

"پس عکسِ خیال" میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس انتخاب میں ارشد صاحب نے ہندوستان کے ان قابلِ قدر ناموں کو بھی شامل کیا ہے جنکی مادری زبان انگریزی نہیں تھی لیکن انہوں نے انگریزی زبان میں ایسا ادب تخلیق کیا جس کے سامنے مغربی ممالک نے بھی سر جھکایا۔ ان میں اربندو گھوش، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور کے نام شامل ہیں جن کی تخلیقات میں اپنی مٹّی کی خوشبو سرگوشیاں کرتی نظر آتی ہے۔ ان قابلِ قدر ناموں کو "پس عکسِ خیال" میں شامل کر کے ارشد صاحب نے نہ صرف یہ کہ اپنی بالغ نظری کا ثبوت فراہم کیا ہے بلکہ خود اپنی کتاب کی افادیت میں بھی اضافہ کیا ہے۔

ارشد صاحب فطری طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ایمائیت، رمز، تغزل، حسنِ بیان اور سہلِ ممتنع سے سجے سنورے اشعار ان کے قلم سے نکلتے ہیں۔ وہ اکثر وبیشتر غزل ہی کہتے رہے ہیں اور غزل ہی کہتے ہیں لیکن وہ شعر گوئی پر مکمل دست گاہ رکھنے کے سبب مختلف اضافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ قاعدے کے مطابق انکی غزلیات کا پہلا مجموعہ "طلوعِ سحر" سب سے قبل شائع ہو جانا

چاہئے تھا حالات جو بھی رہے ہوں مگر انھوں نے منظوم تراجم پر مشتمل اپنی پہلی کتاب ''عکسِ خیال'' ۱۹۵۷ء میں شائع کی۔ ظاہر ہے یہ ترجمے نظموں کے فارم میں ہیں ایسی نظمیں جو آہنگ، ہیئت، مواد اور اسلوب کے اعتبار سے کافی متنوع ہیں۔ یہ نظمیں خود اس صداقت کی آئینہ دار ہیں کہ ارشد صاحب کو نظم گوئی پر بھی پورا عبور حاصل ہے۔ اردو میں افسانہ، ڈرامہ اور ناول کے تراجم پر مشتمل کئی کتابیں نظر سے گذر چکی ہیں لیکن انگریزی کے مشہور شعراء کی قابل ذکر نظموں کے منظوم تراجم پر مشتمل ''پسِ عکسِ خیال'' جیسی کوئی کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گذری ممکن ہے میری کوتاہ علمی کی رسائی ان تک نہیں ہو سکی ہو شاید کوئی اور کتاب بھی کہیں چھپ چکی ہو مگر میرا خیال ہے کہ ''پسِ عکسِ خیال'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو کی پہلی ایسی کتاب ہے جو منظوم تراجم پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔

''پسِ عکسِ خیال'' ارشد صاحب کی ساتویں کتاب ہے۔ خدا سے دعا ہے وہ صحت مند رہیں اچھی اور طویل عمر پائیں اپنی آٹھویں کتاب ترتیب دیں اور خدا وہ دن بھی لائے کہ اُس کتاب کا پیش لفظ بھی مجھے تحریر کرنا پڑے۔

آمین ثمّ آمین!

نصیر پرواز

بھوپال
۱۴/ مارچ ۲۰۰۰ء

پیش لفظ

ہر زبان کی شاعری اپنے شاعرانہ تخیل کی ایک مخصوص دنیا رکھتی ہے لفظوں کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے مگر وہ دنیا ترجمہ کی پکڑ میں نہیں آسکتی مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ ارشاد ایسی تجرباتی حقیقت پر مبنی ہے جس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ کسی زبان کے شعر کی اصل روح اس کی گاتی گنگناتی خصوصیات کے ساتھ دوسری زبان کے قالب میں اُتار دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے انگریزی کافی وسیع اور مالدار زبان ہے اس کے باوجود ترجمہ کرنے والوں کو اُس کی تنگئی دامن کی شکایت رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے الفاظ اور محاورات ظاہری معنیٰ کے علاوہ ایک خاص مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کو ایک ہی لفظ یا محاورے کی مدد سے کسی دوسری زبان میں جذب نہیں کیا جاسکتا۔ پھر نظم کا نظم میں اس انداز سے ترجمہ کرنا کہ دونوں زبانوں کی لطافت اور حلاوت بر قرار رہے نہایت دشوار ہے۔ اگرچہ اُردو زبان اب کافی وسیع ہو چکی ہے اور جہاں تک تخلیقی نظموں کا تعلق ہے وہ شاعر کے فکر و تخیل کی بلند پروازیوں کا پوری کامیابی سے ساتھ دے سکتی ہے، لیکن انگریزی یا کسی ایسی زبان کی نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا جو مزاج، ساخت اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے ہم آہنگ نہ ہوں آسان نہیں اور مترجم کے لئے زبان کی یہ وسعت بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں منظوم تراجم کی کمی ہے مخصوص طور پر دوسری زبانوں کے کامیاب ترجمے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ مترجم دونوں زبانوں سے واقف ہوتا ہے، اُسے

محاورات، طرزِ بیان اور الفاظ کے محلِّ استعمال سے بھی پورا وقوف حاصل ہوتا ہے، پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے اصل زبان کے خیالات کی گرمی، گہرائی جذبہ کی تڑپ، تاثیر کی شدّت اور زورِ بیان کو اسی نزاکت اور لطافت کے ساتھ اپنی زبان میں کھینچ لیا۔ لفظی ترجمہ کرنے والوں کیلئے یہ مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں۔ بھوپال کے نوجوان اور نغز گفتار شاعر ارشدؔ صدیقی نے پندرہ انگریزی نظموں کا ترجمہ "عکسِ خیال" کے نام سے پیش کیا ہے۔ ان میں سے بعض نظمیں نصاب میں بھی شامل ہیں، غالباً اسی لئے اُنھوں نے لفظی ترجمہ کی پابندی اپنے اوپر عاید کر لی ہے، اس قید و بند کے باجود ان کی کوشش میں کامیابی کی جھلک موجود ہے جس نے تاثیر کی شدت کو ماند نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے عام طور پر ترجمہ کے لئے ایسی بحروں کا انتخاب کیا ہے جو پڑھنے والوں کے لئے اجنبی اور غیر مانوس نہیں ہیں، ہیئت کا یہ حسن موضوع اور مواد کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر سامنے آیا ہے۔

ارشدؔ صدیقی فطری طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کی غزل میں گداز، رنگینی دلکشی اور مٹھاس کے عناصر نہایت توازن اور فنی مطابقت کے ساتھ شامل ہوتے ہیں اور یہی چیز اُن کے کامیاب مستقبل کی غماز ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے وہ نظم کی تکنیک کو برتنے پر بھی قادر ہیں ان کی اکثر تخلیقی نظمیں خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

"عکسِ خیال" کو دیکھ کر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ارشدؔ صدیقی نے اپنے ڈھلے ڈھلائے شعور کی مدد سے انگریزی زبان کے حُسن اور تاثیر کو اُردو میں جذب کرنے کی ایسی حسین کوشش کی ہے جسے ناکام نہیں کہا جا سکتا۔ الفاظ کے موزوں انتخاب

سے اُنھوں نے زورِ کلام کو برقرار رکھنے میں پوری شاعرانہ کاوِش سے کام لیا ہے۔ اور مطالب کو الجھنوں سے بچانے میں بھی فنکارانہ چابکدستی دکھائی ہے۔ ایسے عالم میں جب اُردو ادب کا خزانہ دوسری زبانوں کے منظوم تراجم سے تقریباً خالی ہے ارشؔد صدیقی کے اس اقدام کو سراہنا ناگزیر ہے۔

مجھے یقین ہے کہ "عکسِ خیال" کو اردو ادب میں وہ اعلیٰ مقام ضرور حاصل ہو گا جس کا وہ مستحق ہے کیونکہ "عکسِ خیال" اُردو ادب کی ایک ٹھوس خدمت ہے جس نے ہمیں انگریزی ادب کے مشہور فنکاروں کی دماغی اور فکری بلندیوں کو چھونے اور ان کے شعور کی نزاکتوں کو محسوس کرنے کا زرّین موقع دیا ہے۔ ارشؔد صدیقی کا یہ رجحان جو ایک صحت مند شعور کا پتہ دیتا ہے ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہے گا۔

کوثؔر چاندپوری

۲۰/ اکتوبر ۱۹۵۷ء

بھوپال

اقتباسات

(''عکسِ خیال'' کے بارے میں ناقدین کی آراء)

☆

''عکس خیال'' ادبی اعتبار سے جہاں بلند مقام کی حامل ہے وہاں طلباء کیلئے بھی ایک افادی حیثیت رکھتی ہے''۔

پروفیسر ست پرکاش سینگر
(حمیدیہ کالج بھوپال)

☆

''عکسِ خیال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ لفظی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اصل روح پورے طور پر برقرار ہے''۔

پروفیسر ابراہیم یوسف
(بھوپال)

☆

''ارشد صدیقی کے ترجمے میں کہیں اشکال یا ابہام نہیں۔ جنھیں انگریزی پر اس قدر قدرت نہیں کہ وہ اسکی شاعری سے بہرہ اندوز ہو سکیں ان کیلئے ''عکسِ خیال'' کا مطالعہ بہت مفید ہو گا اس سے طلباء خاص طور سے استفادہ کر سکتے ہیں''۔

ڈاکٹر گیان چند جین
(صدر شعبۂ اردو حمیدیہ کالج بھوپال)

☆

''اس مجموعہ میں بعض ترجمے بے حد حسین ہیں اور بالکل اوریجنل معلوم ہوتے ہیں یہ بڑا مشکل کام ہے جو ایک ذہین اور قادرالکلام شاعر کے ہی بس کا ہے''۔

اختر سعید خاں
(بھوپال)

☆

''بقول نیاز فتح پوری'' جناب ارشد صدیقی نے اس مشکل منزل کو
جس آسانی سے طے کیا ہے اسکو دیکھ کر ان کی سخنوارانہ اہلیت کا
قائل ہونا پڑتا ہے'' اس مجموعہ میں اربند و گھوش کو شامل کرتے
ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور اور سروجنی نائیڈو کو نظر انداز کر دینا
باعثِ حیرت ہے''۔

• پس عکسِ خیال میں ان کو شامل کر لیا گیا ہے۔
(ارشد صدیقی)

صہبا لکھنوی
(مدیر ماہنامہ ''افکار'' کراچی)

☆

''ترجمے کی پوری کتاب پیش کر کے ایک اہم کام کی ابتدا کر دی گئی
ہے ایک بنیاد جس پر آگے چل کر انگریزی کی بہترین شاعری اردو
کی عمارت کو شاندار بنانے میں معاون ہوگی''۔

ماجد ادیب بریلوی
(مدیر ہفت روزہ ''روہیلکھنڈ اخبار'' بریلی)

☆

''ارشد صدیقی نے اس مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے
جسکے لئے وہ واقعی قابلِ ستائش ہیں۔ الفاظ کے موزوں انتخاب سے
انھوں نے زورِ کلام کو برقرار رکھنے میں پوری شاعرانہ کاوش برتی
ہے۔ ان کی یہ کوشش دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ہے''۔

حسن رضا
(ماہنامہ ''نئے چراغ'' کھنڈوہ)
(مدیر مظفر حنفی)

☆

"نظم کا ترجمہ نظم میں کرنا اور اس میں تمام لفظی اور معنوی خوبیوں کو بر قرار رکھنا تو بہت مشکل کام ہے۔ ارشدؔ صاحب نے اس مشکل کام کو بہت خوبی اور سلیقہ سے انجام دیا ہے انکی یہ کوشش ہر اعتبار سے قابلِ ستائش ہے"۔

(مولوی) اسرار احمد آزادؔ

(آل انڈیا. ریڈیو دہلی)

☆

"ارشدؔ صاحب نے اردو پابند نظم میں ترجمہ کر کے جراءت کا ثبوت دیا ہے انھوں نے ان نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالتے ہوئے اپنی بہترین شاعرانہ صلاحیتوں اور فنی کاوشوں سے کام لیا ہے"۔

قمر رئیسؔ

(مدیر ماہنامہ "ادیب" علیگڑھ)

☆

"ارشدؔ صاحب چونکہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں اسلئے ترجمہ نہایت شُستہ اور موثر ہے۔ انگریزی شعراء کو اردو داں طبقہ سے متعارف کرانے میں ایک کامیاب کوشش ہے"۔

حکیم یوسف حسن

(مدیر ماہنامہ "نیرنگِ خیال" لاہور)

حاشیہ

ادب کے باشعور قاری اس امر سے بخوبی واقف ہونگے کہ منظوم ترجموں پر مشتمل میرا مجموعۂ کلام "عکسِ خیال" کے نام سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا جس میں انگریزی زبان کے مشہور شعراء کی پندرہ نظموں کے اردو نظم میں ترجمے شامل تھے۔ اور برِصغیر ہندوپاک کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی تھی اب "عکس خیال" میں کچھ ضروری ترمیم اور مزید دس نظموں کا اضافہ کر کے زیرِ نظر تصنیف "پسِ عکسِ خیال" کے نام سے علمی و ادبی حلقوں کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں اس امید پر کہ اس شعری کاوش کے لئے بھی میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

بعض علم دوست اور اہل قلم حضرات کے چند تبصروں کے اقتباسات بھی شامل کتاب ہیں رابندر ناتھ ٹیگور اور سروجنی نائڈو کی نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں کتاب میں شامل تمام انگریزی نظمیں اتنی مشہور ہیں کہ ہر طالب علم کی نظروں سے گذر چکی ہیں اور ان کے ذہنوں میں محفوظ ہیں اس لئے انگریزی متن کی شمولیت ضروری نہیں سمجھی گئی۔

یاد نہیں آتا کہ اس سے قبل اردو کے کسی شاعر نے انگریزی نظموں کے منظوم تراجم پر مشتمل کوئی اردو شعری مجموعہ کتابی شکل میں پیش کیا ہو۔ اس لحاظ سے بھی میری شعری و ادبی کاوشوں کو بہ نظر تحسین دیکھا جانا چاہئے۔ یہی میری فنی کاوش کا سب سے بڑا صلہ ہوگا۔

ارشد صدیقی

بھوپال ۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء

سُنہری پھُول

بھٹکتا پھرتا تھا تنہا میں مثلِ لکۂ ابر
جو تیرتا ہے سرِ کوہ و وادئی و صحرا
پڑی نگاہ یکایک ہجومِ گُل پہ مری
اِک اژدہام میں گُلہائے سادہ و زرّیں
قریبِ جوئے رواں، زیرِ سایۂ اشجار
نسیمِ صُبح کے جھونکوں میں رقص فرما تھے

نجوم جیسے مُسلسل چمکتے رہتے ہیں
ہزاروں جلوے لئے کہکشاں کے دامن پر
یونہی وہ پھُول بھی لاانتہا قطاروں میں
حسیں خلیج کی آغوش میں تھے بکھرے ہوئے
بہ یک نگاہ ہزاروں مجھے نظر آئے
کہ محوِ رقص تھے جو سرخوشی کے عالم میں

اُنھیں کے پہلو میں رقصاں تھیں آتشیں موجیں
مگر گلوں کی تجلّی کا کچھ جواب نہ تھا
پھر ایسی صحبتِ دل آفریں میں اِک شاعر
خوشی سے جھوم نہ اُٹھتا تو اور کیا کرتا؟

میں جلوہ زار میں کھو کر یہ سوچ بھی نہ سکا
کہ اِس نظارے نے بخشی ہے مجھکو کیا دولت

اب اپنے صوفے پہ جب بھی دراز ہوتاہوں
تفکّرات کے لمحوں میں یاکہ مہلت میں
تو چشم دل میں وہی پھُول جگمگاتے ہیں
وہ چشمِ دل کہ جو تنہائیوں کی نعمت ہے
یہ پھُول روح میں نغمے بِکھیر دیتے ہیں
اوراِن کے ساتھ مِرادل بھی رقص کرتاہے

•

"The Daffodils"

by W.Worlds worth

پیمانۂ صبر

لوگ گھر میں لائے جب اُس کے جری شوہر کی لاش
اس کی آنکھیں ،اس کے لب محرومِ اشک و آہ تھے
عورتوں نے یہ سماں دیکھا تو یوں گویا ہوئیں
"جان لیوا ہو نہ ثابت اس کا ضبطِ دلخراش"

نرم لہجے میں کہا ہر مونسِ ذی ہوش نے
"اِک شناسائے محبت آج رخصت ہوگیا
اِک حقیقی دوست اِک نقشِ وفاجاتا رہا"
پھر بھی کچھ جُنبش نہ کی اس کے لبِ خاموش نے

چپکے سے اپنی جگہ سے اُٹھ کے اِک خاتون نے
اور دبے قدموں سے جاکر لاش کے بالکل قریب
چہرۂ مرحوم سے اُس کا کفن سرکا دیا
چشم ولب اُسوقت بھی اس کے مگر ساکت رہے

ایک نوّے سالہ بوڑھی خادمہ آگے بڑھی
گود میں مرحوم کے بچّے کولاکررکھ دیا
آنکھ سے اشکوں کی جھڑیاں لگ گئیں ، وہ چیخ اُٹھی
"میرے بچّے ! تیری خاطر میں تو زندہ ہوں ابھی

•

"Home they brought her warrior dead"

by L.Tennyson.

بسنت کا آخری پھول

مدھورت کا یہ ایک اکیلا پھول ابھی تک جھوم رہا ہے
جِس کے سارے سنگی ساتھی مُرجھا کر دم توڑ چکے ہیں
کوئی نہیں ہے جِس کا اپنا، ایک کلی بھی پاس نہیں ہے
جو اُس کی مُسکان پہ مُسکائے، آہوں میں آہ ملائے

میں نہ تجھے چھوڑوں گا اکیلا ڈالی پر مُرجھا جانے کو
سو گئے تیرے من کے پیارے تو بھی اُنہیں میں جا کر سو جا
توڑ کے تیری پنکھڑیوں کو لا اُس کیاری پر پھیلا دوں
جِس میں تیرے سنگی ساتھی بے خوشبو بے جان پڑے ہیں

میں بھی ترے پیچھے آؤں گا ہمدردی جب مٹ جائیگی
اور بکھر جائیں گے میری پیار کی مالا کے سب موتی
جب سچے دل مُرجھا جائیں اور بچھڑ جائیں سب ساتھی
پھر اِس درد بھری دنیا میں کون اکیلا رہ سکتا ہے؟

•

"The Last Rose of summer"

by Thomas Moore.

فطرتِ معصوم

جہانِ سادہ کا معصوم آرزو بچّہ،
جو بُنتا رہتا ہو سانسوں میں نرم افسانے
جو کرتا رہتا ہو رگ رگ میں زندگی محسوس
بھلا وہ موت کی فطرت کا راز کیا جانے!

ملی مجھے کِسی دہقاں کی اِک حسیں بچّی
بقولِ خود جو ابھی صرف آٹھ سال کی تھی
ہزاروں پیچ تھے جسکے گھنیرے بالوں میں
تھی جِس کی زُلف ابھی سر کے گِرد اُلجھی ہوئی

پلی ہوئی تھی جو وحشت زدہ فضاؤں میں
نہ تھا لباس پہننے کا جس کو کوئی شعور
وہ اُس کے دیدۂ شفاف ، وہ رُخِ سادہ!
کہ جن کے کیف نے دل میرا کردیا مسرور

سوال میں نے یہ اُس سے کیا کہ "کیوں بیٹی"
"تمہارے کتنے بھائی بہن ہیں سبھی ملکر؟"
وہ بولی "کتنے بہن بھائی! سات ہیں ہم لوگ"
یہ کہہ کے اس نے تعجب سے مجھ پہ ڈالی نظر

" وہ سب کہاں ہیں؟ براہِ کرم بتاؤ مجھے"
کہا کہ " سات ہیں ہم جو قیام کرتے ہیں

یہاں سے دور ہیں دو کانوے میں رہتے ہیں
ہیں اور دو جو سمندر پہ کام کرتے ہیں

اور اِس کلیسا کے آنگن میں سو رہے ہیں دو
ہیں دونوں بھائی بہن تم سے ٹھیک کہتی ہوں
اسی کلیسا کی چھوٹی سی ایک کٹیا میں
اِنھیں کے پاس میں اماں کے ساتھ رہتی ہوں"

"یہ تم نے کیا کہا؟ دو کانوے میں رہتے ہیں
گئے ہیں دوسرے دو کام کو سمندر پر
تو پھر بتاؤ مجھے اے مِری حسیں بچّی!
کہ اِس حساب سے ہوتے ہو سات تم کیوں کر؟"

یہ سُن کے ننھّی سی بچی نے مجھ کو سمجھایا
"کہ دیکھو! سات بہن بھائی ہم ہیں سب ملکے
یہ دو کلیسا کے آنگن میں سو رہے ہیں یہاں
اِسی کلیسا کے اندر درخت کے نیچے!"

"نہیں نہیں، مِری بچّی بھٹک رہی ہو تم!
تُمہارے جِسم کے اعضا تو ہیں حیات آگیں
اگر کلیسا کے آنگن میں سو رہے ہیں دو
تو صرف پانچ بہن بھائی تم ہوئے کہ نہیں؟"

وہ بولی" اُن کے ہرے مقبرے تو زندہ ہیں
اُگا ہے اب بھی وہاں سبزہ دیکھ لو جا کر!

ہماری اماں کے دروازے سے ذرا آگے
وہ دونوں پہلو بہ پہلو بنے ہوئے ہیں اُدھر!

وہیں تو بیٹھ کے بُنتی ہوں اپنے موزے میں
وہیں تو پھول بھی رومال میں بناتی ہوں
وہیں تو بیٹھ کے فرشِ زمیں پہ گھنٹوں تک
میں گنگنا کے نئے گیت اُنہیں سناتی ہوں

اُسی جگہ پہ تو اکثر غروبِ شام کے بعد
میں اپنا ننّھا سا پیالہ بھی لیکے جاتی ہوں
سُہانی رات میں جب چاندنی چھٹکتی ہے
تو اپنا کھانا وہیں بیٹھ کر میں کھاتی ہوں

مَری جو پہلے پہل، وہ تھی جینؔ ہمشیرہ
جو آہیں بھرتی تھی لیٹی ہوئی بچھونے میں
خدا نے دے ہی دیا اُسکو پھر سکوں آخر
تمام ہوگئی تکلیف اُس کی سونے میں

غرض کہ صحنِ کلیسا میں محوِ خواب ہے وہ
سِسک سِسک کے جو آلام و درد جھیلتی تھی
تھا سبزہ سوکھا ہوا جب تو اُسکی قبر کے گِرد
میں اپنے جونؔ برادر کے ساتھ کھیلتی تھی

زمین پالے کے گِرنے سے پھر سفید ہوئی
تو دوڑ دوڑ کے ہم برف پر پھسلنے لگے

اُسی زمانے میں پھر جوؔن کو بھی جانا پڑا
بہن کے پاس غرض بھائی سو گیا جا کے"

کیا سوال یہ میں نے کہ "اب بچے کتنے؟
چلے گئے ہیں اگر دونوں وہ خدا کے گھر؟"
بگڑ کے بچّی نے بیساختہ جواب دیا:
"کہ سات بھائی بہن ہیں جناب سب ملکر"

"وہ دو تو مر ہی گئے ہیں وہ دو تو چل ہی بسے
اب اُنکی روحیں تو ہیں آسماں پہ" میں نے کہا

مگر وہ بچّی مِری بات کب سمجھتی تھی!
اُسے تو اپنی ہی مرضی سے کام تھا گویا
"کہ ہم تو سات بہن بھائی ہیں سبھی ملکر"

•

"We are Seven"

by W.Wordsworth

دھنک

میرا دل فرطِ مسرّت سے اُچھل پڑتا ہے
آسماں پر نظر آتی ہے دھنک جب مجھ کو

میرے بچپن کے زمانے میں تھی اس کی یہی شکل
اور اب بھی ہے یہ ویسی ہی کہ جب میں ہوں جواں
عمرِ آخر میں بھی اس کی یہی صورت ہوگی
اور یہی شکل رہے گی مِرے مرجانے کے بعد

بچپن انسان کی فطرت کو جنم دیتا ہے
میری خواہش ہے کہ بندھ جائیں مِری عمر کے دن
اُسی معصوم محبّت کے حسیں رِشتے میں
(فطرتاً ہوتی ہے بچّے کو جوماں باپ کے ساتھ)

•

"The Rainbow"

by W. Wordsworth.

موجودہ لمحہ

اُٹھ! کہ اب دن بھی گُذرنے کے قریب آپہنچا
اور پڑا سوتا ہے تو خوابِ گراں میں اب تک
دوسروں نے تو زرہ کَس کے کمر باندھ بھی لی
اور آگے گئے میداں کی طرف لڑنے کو

منتظر ہے تری آمد کا مگر تیرا مقام
کچھ نہ کچھ کام تو ہر شخص کو کرنا ہوگا
آج ”مستقبل“ و ”ماضی“ کی حقیقت کیا ہے؟
آج بس ”حال“ کی سنجیدگی کام آئے گی

اُٹھ! بھُلادے نگہہ و ذہن سے آئندہ کے خواب
یعنی اِک سخت مُہم کرکے تو میداں لے گا
کہیں ہوتے ہیں ہواؤں پہ بھی قلعے تعمیر؟
دیو پیکر سے کہیں دوڑ میں کیجاتی ہے شرط؟

تجھ کو آئندہ فتوحات بھی سرکرنی ہیں
اور عزّت بھی خداچاہے تو چومے گی قدم
دست وبازو ترِے مضبوط نہ ہونگے لیکن
اہمیت "آج" کی تجھ کونہ اگر آئی نظر

اٹھ! اگر روک رہا ہے تجھے تیرا "ماضی"
اُس کے ہردردو مسرّت کو بھُلا دے دل سے

تجھ کو پچھتاوے نے بیکار جکڑ رکھا ہے
کوئی زنجیر بھی اِس درجہ سُبکسار نہیں
"ماضی" غمگیں یا درخشاں سہی مُردہ ہی تو ہے
اس کی تخیئل کے ہتھیاروں کو اب پھینک بھی دے
اپنے ماضی کی طرف اس طرح مُڑ مُڑ کے نہ دیکھ
"آج" کے جہد و عمل کے لئے جینا ہے تجھے

اُٹھ ! کہ اب دن بھی گذرنے کے قریب آپہنچا
اور یہ آواز جو مشکل سے تو سُن سکتا ہے
فوجِ اعدا ہی کے قدموں کی تو آواز ہے یہ
اُٹھ! ذرا دیکھ، وہ دشمن بھی قریب آپہنچا

دھار ہتھیاروں پہ کرنے کا بھی اب وقت نہیں
ورنہ یہ لمحۂ آخر بھی گذر جائے گا
اور جب چونکے گا آئندہ کی اِس جنگ سے تو
تجھ کو یہ لمحہ بھی ماضی ہی نظر آئے گا

•

"Now"

by A.A. Procter

عَالِم

گُذر گئی عُلمائے سَلف میں عمر مِری
میں دیکھتا ہوں فضائے بسیط میں ہر سمت
جہاں جہاں بھی اُچٹتی نگاہ پڑتی ہے
اِنھیں بزرگوں کے اعلیٰ دماغ پھیلے ہیں
کبھی فریب نہیں دیتے مجھ کو یہ احباب
میں کرتا رہتا ہوں ہر روز گفتگو اِن سے

انھیں سے پاتا ہوں راحت کے وقت کیف ونشاط
انھیں سے ملتی ہے تسکین بھی اذیّت میں
میں اپنے دل میں کبھی جب خیال کرتا ہوں
کہ اِن بُزرگوں کے مجھ پر ہیں کِس قدر احسان
تو بھیگ جاتے ہیں رُخسار میرے اشکوں سے
جو غور و فکرِ تشکّر میں بہہ نکلتے ہیں

مِرا تمام تخیّل ہے اِن سے وابستہ
کہ اِن کے ساتھ گذاری ہے زندگی میں نے
بُرائیوں سے بچا، خوبیوں کو پیار کیا
اُمید و بیم میں اِن کا شریکِ حال رہا

مِلا ہے مجھ کو اِنھیں کی مثال سے یہ سبق
کہ درس لیتا ہوں بن کر میں ایک ادنیٰ دماغ
مِری تمام اُمیدیں ہیں اِن سے وابستہ
کہ اِن کے پاس ہی کرنا ہے مجھ کو جاکے قیام

اِنھیں کے ساتھ تو کرنا ہے طے سفر مجھ کو
وہ اِک سفر کہ جو جاری رہے گا تابہ ابَد
مجھے یقین ہے وہ نام چھوڑ جاؤں گا
کبھی جو خاک میں مِلکر بھی مٹ نہیں سکتا

•

"The Scholar"

by Southey.

تِیر و نغمہ

میں نے اِک تِیر خلاؤں میں کبھی پھینکا تھا
وہ کہاں جا کے گِرا، یہ مجھے معلوم نہیں
اس کی رفتار کی تیزی کو نظر کیا پاتی؟
رہ گئی کھنچ کے تخیّل میں فقط ایک لکیر

میں نے اِک نغمہ فضاؤں میں کبھی چھیڑا تھا
وہ کہاں جا کے رُکا، یہ مجھے معلوم نہیں
کِس کی نظروں میں ہے وہ قوّتِ پرواز کہ جو؟
کر سکے نغمۂ شاعر کی بلندی کو اسیر

بعد مدّت کے جب آیا مجھے وہ تیر نظر
میں نے اِک نرم شجر میں اُسے چسپاں دیکھا
اور وہ نغمہ جو چھیڑا تھا فضاؤں میں کبھی
اپنے اِک دوست کے سینے میں فروزاں دیکھا

•

"The Arrow and the Song"

by Long fellow

بجنے پائے نہ کلیسا کا گجر آج کی رات!

آفتابِ رُخِ برطانیہ رفتہ رفتہ
ہوتا جاتا تھا پسِ پردۂ کہسار غروب
ذرّے ذرّے پہ تھا بکھرا ہوا حُسنِ تنویر
دن کی افسردگی و غم کا مداوا بن کر
آخری کرنوں نے بوسہ دیا وقتِ رُخصت
ایک دوشیزہ اور اِک مرد کی پیشانی کو
مرد اِک سُست قدم اور پریشاں رفتار
اور دوشیزہ کے کاکُل تھے ہوا میں لرزاں
جُھک گیا مرد کا سربارِ تفکّر کے تلے
اور دوشیزہ کے بے رنگ وخنک ہونٹوں سے

سِسکیاں بن کے اُبلنے لگے دل کے جذبات
''بجنے پائے نہ کلیسا کا گجر آج کی رات''

اُس کے بے رنگ لبوں میں ہوئی جُنبش پیدا
بوڑھے زنداں کی طرف اُس نے اشارہ کر کے
جس کی دیواریں تھیں تاریک، اُداس اور نمناک
سخت تاریک وبلاخیز — کہا ''اے بابا''
''میرا محبوب مُقیّد ہے اِسی زنداں میں
آج کی رات اُسے قتل کیا جائے گا
جبکہ گونجے گی کلیسا کے گجر کی آواز

کوئی دُنیاوی مددپاس نہیں ہے میرے
بادشہہ رات سے پہلے تو نہیں آسکتا!''

ہو گئے اور بھی بے نور پھر اُس کے لبِ خشک
دھیمی آواز میں جس وقت کی اُس نے درخواست
"بجنے پائے نہ کلیسا کا گجر آج کی رات !"

"مدّتوں میں نے بجایا ہے کلیسا کا گجر
اِسی افسردہ و ظلمات نِشاں گنبد سے
اور ہر شام کہ جس وقت چھپا ہے سورج
رُخصتِ وقت کا اعلان کیا ہے میں نے
میں ادا کرتا رہا ہوں ہمہ اوقات یہ فرض
میری کوشش یہ رہی ہے کہ میں پابند رہوں
آخری عمر میں اب آنے دوں کیوں الزامات؟
بجنا لازم ہے کلیسا کا گجر آج کی رات"

رنگِ رُخ اُڑنے لگا، آنکھوں میں وحشت چمکی
جاگ اُٹھی ماتھے پہ سنجیدہ تفکّر کی شکن
اور دوشیزہ نے جذبات کی گہرائی کے ساتھ
کرلیا چپکے سے اِک عہدِ مصمّم دل میں
جب بھی آنکھوں میں نمی تھی نہ لبوں پر آہیں
جبکہ انصاف کا یہ حکم سُنا تھا اس نے
کہ کلیسا کا گجر بجنے کی آواز کے ساتھ
اُس کے محبوب کا دَم گھونٹ دیا جائے گا
ہوگیا اور بھی پھر تیز تنفّس اُسکا
بڑھ گئی پھیلی ہوئی آنکھوں میں کچھ اور چمک
کہہ سکی ایک ہی سِسکی میں وہ مشکل سے یہ بات
''بج سکے گا نہ کلیسا کا گجر آج کی رات!''

ہلکے قدموں کے سہارے سے وہ اُچھلی آگے
اور گذر ہی گئی زنداں کے پُرانے در سے
چھوڑ کر چلتا ہُوا بوڑھے کو اُن راہوں پر
جن پہ وہ رینگتا آیا تھا یونہی برسوں سے
ایک لمحہ بھی نہ دوشیزہ نے کچھ غور کیا
کرکے روشن بجبہ و رُخ پہ اُمیدوں کے چراغ
تیرہؔ و تار منارے پہ قدم رکھ ہی دیئے
جہاں لٹکا ہوا جُھباں تھا کلیسا کا گجر
گَرد آلود ہر اِک سیڑھی پہ رکھ رکھ کے قدم
اس اندھیرے میں کہ کرنیں بھی جہاں جانہ سکیں
بڑھتی جاتی تھی وہ ہونٹوں پہ لئیے ایک ہی بات
"بج سکے گا نہ کلیسا کا گجر آج کی رات"

دیکھنا، آخری سیڑھی پہ وہ اب جا پہنچی
سر پہ وہ لٹکا ہوا ہے بڑا کالا گھنٹا
وحشت انگیز اندھیرا ہے فضاؤں کے تلے
وہ اندھیرا کہ بیاں کرنا بھی جسکا دوبھر
دیکھنا ،وہ ہلی گھنٹے کی بَلا خیز زباں
وہ گجرِ بجنے کا لمحہ بھی قریب آپہنچا
اِس نظارے نے تو دل کردیا دوشیزہ کا سرد
رُک گئی سانس وہیں اُڑ گیا رخسار کا رنگ
''کیا میں بجنے دوں گجر؟ یہ تو نہیں ہوسکتا''
یک بیک اس کی نگاہوں میں چمک جاگ اُٹھی
اُچھلی اور اُس نے گجر تھام لیا باندھ کے ہات
''بج سکے گا نہ کلیسا کا گجر آج کی رات''

اور وہ بوڑھا کہ جو کھینچ رہا تھا رسّی
بہرا ہونے کے سبب سُن نہ سکا کوئی صدا
اُس نے سوچا کہ کلیسا کے گجر کی آواز
بن گئی ہوگی جواں شخص کا پیغامِ اجل
اور یہاں کرلی حسینہ نے گرفت اور بھی سخت
خشک اور کانپتے ہونٹوں کی صداؤں کے تلے
یوں دباتی رہی وحشت زدہ دِل کے جذبات
"بج سکے گا نہ کلیسا کا گجر آج کی رات!"

آخرش ختم ہُوا گھنٹے کی رسّی کا کھنچاؤ
اور دوشیزہ پھر اِکبار اُسی جراءت سے
خاک میں لپٹے ہوئے زینے پہ اُستادہ ہوئی

جہاں صدیوں سے پڑا تھا نہ قدم اِنساں کا
آج کی رات تو وہ کام کیا تھا اُس نے
تذکرہ جس کا کیا جائے گا اِک مدّت تک
اور چھُٹتے ہوئے سورج کی سُنہری کِرنیں
جب فضاؤں میں بکھیریں گی دل آویز چمک
جُنبشیں بوڑھے سروں کو یونہی دیدے کے بزرگ
ننّھے بچّوں کو سنائیں گے ابد تک یہ بات
"بج سکا تھا نہ کلیسا کا گجر آج کی رات"

شاہِ برطانیہ آپہنچا وہ کہساروں سے
اُس کے چہرے پہ حسینہ نے جمادیں نظریں
جل رہے تھے وہاں اُمیّد و مسرّت کے چراغ

اِک نشاں بھی نہ تھا موجود تفکّر کا کہیں

گِر کے قدموں پہ وہ کہنے لگی اپنا قصّہ

اور دکھلاتی رہی زخموں سے رستے ہوئے ہاتھ

دیکھ کر اُس کے دل آویز و حسیں چہرے کو

شدّتِ غم سے جو مُرجھایا ہوا تھا اب تک

شاہ کے دل میں ہُوا رحم کا جذبہ بیدار

جاگ اُٹھی یک بیک آنکھوں میں چمک، وہ بولا

"بخش دی جا، ترے محبوب کو ایک اور حیات

بج سکے گا نہ کلیسا کا گجر آج کی رات!"

•

"Curfew must not ring to -night"

by .Rosa H. Thorpe.

تشویش

میں ترے پیار سے ڈرتا ہوں مری روحِ جمال!
تجھ کو لیکن مری اُلفت سے خطر کیا معنی؟
میں ترے لہجہ و جُنبش سے جھجک جاتا ہوں
خوف تجھ کو مری باتوں سے مگر کیا معنی؟

ہے مری روح تو اِحساس کی گہرائی میں
کھیل سکتی ہے جہاں روحِ محبّت تیری
میرے جذبات تو معصوم ہیں اے جانِ بہار!
جن سے کرتا ہوں میں ہر وقت عبادت تیری

•

"I fear thy kisses"

by Shelley.

خوابوں کا بازار

بھرے بازار میں بِکتے اگر خوابوں کے افسانے
تو اے شاعر! تو اُس بازارِ بے پایاں سے کیا لیتا؟
کچھ ایسے خواب جن کی نقد پیغامِ اجل ہوتی
کچھ ایسے جو اِک آہِ نرم ونازک ہی میں ملجاتے
وہ آہِ نرم جس سے زیست کے تاجِ درخشاں کا
فقط اِک برگِ گُل جنبش میں آکر ٹوٹ جاتا ہے
بھرے بازار میں بکتے اگر خوابوں کے افسانے
مسرّت بخش وغم انگیز سیلابوں کے افسانے
اور اُن کا بیچنے والا صلائے عام جب دیتا
تو اے شاعر! تو اُس بازارِ بے پایاں سے کیالیتا؟

میں لیتا عالمِ خاموش میں وہ مسکنِ تنہا
جہاں ہنستے ہوئے پھولوں کی اِک رنگیں روش ہوتی
وہ جس کے سائیہ دامن میں بے پایاں سکوں ہوتا
جو میرے آخری دم تک مِری غمخواریاں کرتی
میں تاجِ زیست کا ہر گوہرِ شہوار دیدیتا
گِرا دیتا خوشی سے خود کو میں آغوشِ فطرت میں
خریداری گراں کی ہوتی میرے دستِ قدرت میں
بھرے بازار میں مجھ کو یہی اِک خواب راس آتا
کہ اِس سے دل کا ہر رستا ہوا ناسُور بھر جاتا

•

"Dream Pedlary"

by Thomas Lovell

ترانۂ زندگی

سُناؤ مجھ کو نہ اِس طرح غم زدہ نغمے
''کہ زندگی تو فقط خواب ہے خلاؤں کا''
وہ روح جو نہ ہویدا ر، روحِ مُردہ ہے
معاملات بظاہر کچھ اور ہوتے ہیں

حیات ایک حقیقت ہے، اِک صداقت ہے
اور اس کی منزلِ مقصود صرف قبر نہیں
''تُو ایک پیکرِ خاکی ہے، ہوگا خاک سپُرد''
یہ حکم روح کے بارے میں کب ہوا تھا مگر؟

الم ہو یاکہ مسرّت، یہ دونوں کیفیّات
نہ زندگی کا مقدّر نہ اپنی قسمت ہیں
مگر عمل، کہ یہی زندگی کا حاصل ہے
اِسی سے ہوتا ہے اِنساں کی زندگی کو فروغ

عمل طویل ہے اور وقت اُڑتا جاتا ہے
اور اپنے قلب جو ظاہر میں ہیں قوی وجری
دھڑکتے رہتے ہیں اُس غمزدہ ڈھل کی طرح
جنازہ لیکے جو جاتا ہے قبر کی جانب

یہ رزم گاہِ جہاں اِک وسیع میداں ہے
یہاں ہر ایک قدم پر ہے کارزارِ حیات

چلو نہ رینگتے گونگے مویشیوں کی طرح
یہاں کے جہدو عمل کے لئے دلیر بنو

کرو نہ "کل" پہ بھروسہ، وہ خوشگوار سہی
"گذشتہ کل" کو بھی چھوڑو وہ کل تو مردہ ہے
عمل کو "آج" سے نسبت ہے آج کام کرو
ہو دل میں عزم تو قدرت بھی ساتھ دیتی ہے

عظیم زندگیاں ہم کو یہ بتاتی ہیں
کہ ہم بھی زندگی اپنی سنوار سکتے ہیں
اور اِس جہاں سے ہوں رخصت تو چھوڑ سکتے ہیں
نقوشِ پائے عمل ریگِ وقت پر ہم بھی

نقوش، جن سے کوئی اپنا دوسرا بھائی
جو بحر ہستئ خاموش سے گذرتے ہوئے
ہو سہما سہما اکیلا شکستہ کشتی میں
نئے سفر کے لئے پھر سے تازہ دم ہو جائے

تو پھر اُٹھو کہ کوئی کام اختیار کریں
رہیں ہر اچھے بُرے حشر کے لئے تیّار
بنائیں جہدِ مُسلسل کو زندگی کا شعار
عمل کے بعد نتیجے کا انتظار کریں

•

"The Psalm of Life"

by Longfellow.

ماتا کو پرنام

اے ماتا تجھ کو پرنام!

تو چشموں سے مالا مال
باغ ترے کرنوں کے جال
مست ہوا ٹھنڈک برسائے
ہری بھری کھیتی لہرائے
تیری شکتی بڑی مہان
آزادی تیرا شُبھ نام
اے ماتا تجھ کو پرنام!

چمکیلے سپنوں کی جیت!
چشموں اور شاخوں کے گیت
تیرے پیڑوں کے پھل پھول
جیون من کے سُکھ سنگیت
ہنستے میٹھے پیار کی چھاؤں
چوم لوں اے ماں! تیرے پاؤں

اے شیریں اور نرم کلام! اے ماتا تجھ کو پرنام!

کون یہ کہتا ہے اے ماں؟
تیری دھرتی ہے کمزور
ہاتھوں میں لے کر تلوار
جاگے جب پینتیس کرور

جب گرجے پینتیس کرور
لے کر تیرا نام مہان
دیش کے کونے کونے میں
گونج اُٹھی اُن کی للکار
کِتنے شکتی شالی لوگ
بَل اور بُدّھی سے بھرپور
کہتے ہیں تجھ کو بھگوان
تیرا ہے سب پر کلیان
ہمیں بچا اور دے سمان
ایک تُجھی سے ہے فریاد
دُشمن جس نے مار بھگائے
میداں اور سمندر پار
اور کیا خود کو آزاد

تو ہی عقل، تو ہی قانون
تو ہی من جیون اور سانس
ہم کو تیرے پیار کی آس
تو من میں وہ بھاؤ جگائے
موت کو بھی جو مار بھگائے
ہر شکتی تیرا وردان
ہاتھوں کو کرتا بلوان

سُندر، موہن، سُکھ وِشرام! اے ماتا تجھ کو پرنام!

تو چشموں سے مالا مال
باغ ترے کرنوں کے جال

تو رنگینی سے بھر پور
تیری بھاشا نور ہی نور
تو ساری قوموں کا میل
پیار محبّت تیرے کھیل
جیت بھری تیری مُسکان
تو سب دیشوں کی پردھان
تیرے شکتی شالی ہاتھ
کرتے ہیں دَھن کی بوچھار
اے ماتا! تیرا وردان
کتنا سُندر اور مہان!
آزادی تیرا شبھ نام! اے ماتا تجھ کو پرنام!

•

"Hymn To Mother"

by Arbindo Ghosh.

تاتاری

اگر میں شہنشاہِ تاتار ہوتا
نہ ہوتا کوئی دوسرا میرا ثانی
مسہری مِری ہاتھی دانتوں کی بنتی
مِرا تخت سونے کی چادر کا ہوتا
مِرے محل میں لاکھوں طاؤس پھرتے
مِرے دشت میں شیر تفریح کرتے
اُچھلتی ہوئی تال کی مچھلیوں کے
چمکدار پَر دھوپ میں جھلملاتے

اگر میں شہنشاہِ تاتار ہوتا!
توشاہی مُغنّی ترانوں کی لے میں
مجھے میرے کھانے پہ ہردن بُلاتے
مِرے محل میں روز شہنائی بجتی
شراب اورشہد اس قدر لال پیلے
سرِ شام ہی قمقمے جگمگاتے
رَباب اور گیتاروں نے روز مجھکو
خوش آواز میٹھے ترانے سُناتے

اگر میں شہنشاہِ تاتار ہوتا
میں پوشش پہنتا نئے موتیوں کی

سُنہری سفید اور ہرے موتیوں کی
گھنے اور باریک سے موتیوں کی
سحر کا ستارہ نہ جب جھلملاتا
پہن کر میں پوشاک تلوار کستا
سواری مری کھینچتے سات گھوڑے
اندھیرے میں تاتار کے راستوں سے

میں کہلاتا تاتاری میوں کامالک
میں شاداب وشفاف چشموں کامالک
میں تاتار کے کوہساروں کا مالک
گلی، جنگلوں، سبزہ زاروں کامالک

چمکتے ستاروں ، مہکتی ہواؤں
سمندر کے مانند چمکیلی جھیلوں،
پرندوں کو خوش کرنے والے درختوں،
غرض ساری چیزوں کا مختار ہوتا

اگر میں شہنشاہِ تاتار ہوتا
●

"Tartary"

by Walter dela Mare.

گاؤں کا لوہار

یہ جو موضع میں ہے اخروٹ کا پھیلا ہوا پیڑ
کارخانہ ہے لوہاری کا اِسی کے نیچے
اور لوہار، ایک جسیم اور قوی مرد ہے وہ
ہاتھ ہیں جس کے دراز اور نہایت مضبوط
اُس کے پُرزور جواں بازو کا اِک اِک عضلہ
اِسقدر سخت ہے جیسے کوئی فولاد کی چھڑ

اُس کے شب رنگ و سیہ بالوں میں سختی کی نمود
اُس کے تپتے ہوئے چہرے پہ مشقت کی کِرن

اور ماتھے پہ ہے محنت کے پسینے کی نمی
جو بھی ہوسکتا ہے اُس سے وہ کمالیتا ہے
سارے عالم سے ملاسکتا ہے اپنی نظریں
کیونکہ دنیا میں کسی کا بھی وہ مقروض نہیں

صبح سے رات گئے تک یونہی پورا ہفتہ
دھونکنی اُس کی بھرا کرتی ہے لمبی سانسیں
اُٹھتے گِرتے ہوئے اِک بھاری ہتھوڑے کی کھنک
کرتی رہتی ہے بلند اپنی مسلسل آواز
گاؤں میں جیسے "گِرزدار" سدھے ہاتھوں سے
شام کے وقت بجاتا ہے کلیسا کا گجر

بچّے اسکول سے جاتے ہوئے گھر کی جانب
اُس کے دروازے پہ آ آ کے ٹھہر جاتے ہیں
دیکھتے ہیں وہ بڑے چاؤ سے بھٹّی کی دہک
دَھونکنی کی بھی صداؤں کو سُنا کرتے ہیں
اور پکڑ لیتے ہیں چنگاریاں خوش ہو ہو کر
جو اُڑا کرتی ہیں کھلیان کے بھُو سے کی طرح ۔

گاؤں کے گِرجے میں بھی جا کے ہر اتوار کو وہ
بیٹھ جاتا ہے کہیں اپنے ہی لڑکوں کے قریب
پادری کی بھی وہ تبلیغ پہ رکھتا ہے نظر
اپنی بیٹی کی بھی آواز سُنا کرتا ہے

گایا کرتی ہے جو گرجا میں مُقدّس نغمے
اور کرلیتا ہے یوں دل کو وہ اپنے مسرور

اُس کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ خود ماں اس کی
باغِ فردوس میں ہے بیٹھی ہوئی نغمہ سرا
کرنا پڑتا ہے پھر اِکبار اُسے یہ بھی خیال
کہ وہ کِس طرح پڑی ہوگی لحد کے اندر
پھر وہ آنکھوں سے ٹپکتا ہُوا کوئی آنسو
سخت اور کھُردرے ہاتھوں سے رگڑ لیتا ہے

کبھی محنت، کبھی خوشیاں، کبھی رنج و آلام
یُوں رہِ زیست میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

صبح کر دیتا ہے ہر روز کوئی کام شروع
شام پھر اُس کو عطا کرتی ہے اسکی تکمیل
اِسی تکمیل، اِسی کوشش و محنت کے سبب
رات بھر کے لئے وہ نیند کما لیتا ہے

شکریہ تیرا کہ تو قابلِ تعظیم ہے دوست!
تجھ سے ملتا ہے ہمیں کتنا بڑا درسِ حیات!
زندگانی کی دہکتی ہوئی اِس بھٹّی میں
ڈھال سکتے ہیں یونہی ہم بھی مقدّر اپنے
اور کھنکتی ہوئی اِس دل کی نہائی پہ یونہی
اپنے تخیئل و عمل ہم بھی بنا سکتے ہیں

•

"TheVillage Blacksmith"

by Longfellow.

مشیّتِ وقت

کسقدر جلد یہ وقت، اُٹھتی جوانی کا یہ چور
لے اُڑا اپنے پروں پر، مرے تیئیس برس
تیز رفتار سے اُڑتے رہے ایامِ حیات
چھو سکا میری بہاروں کو نہ غنچوں کا نفس

میری صورت نے دیا ہو گا حقیقت کو فریب
ورنہ یہ وقتِ بلوغ آگیا مجھ تک کیسے؟
اور باطن کا شعور اب بھی نمایاں نہ ہُوا
عارضی کیف و مسرّت میں نہاں ہو جیسے

وہ کم و بیش سہی، جلد نہیں دیر سہی
ہو رہا ہے یہ سبھی کچھ مری قسمت بن کر
جیسے پستی سے بلندی کی طرف خود مجھ کو
وقت کھینچے لئے جاتا ہو مشیّت بن کر

•

"On arriving at the age of Twenty-three"

by John Milton.

تحفہ

دئے ہیں سبزہ زار ودشت کو تونے رواں چشمے
عطا کی باز اور شاہین کو پرواز کی کاوِش
حسیں چیتے کو بخشی ایک شانِ دلکشی تونے
عطا کی قمریوں کو ہلکے اوُدے رنگ کی پوشش

مجھے یارب! نِشاطِ عشق کالمحہ عطا کردے!

صدف مدّو جزر کے بخشے غوطہ زن کے ہاتھوں کو
دیا دولھا کی آنکھوں کو دلھن کا خوبرو چہرہ
وہ جن کے ذہن ودل ہیں خوشنما خوابوں کے شیدائی
انھیں بخشی جوانی کے حسیں خوابوں کی گہرائی

مجھے یارب! خلوصِ دل کاآئینہ عطاکردے!

سبھی پیغمبروں، سنتوں کو صوفی رہنماؤں کو
عقائد اور اُن کے مسلکوں کی شادمانی دی
عطا کی سُرخروئی تونے سرداروں کو، شاہوں کو
اور اُن کے کارناموں کے صلے میں کامرانی دی
فضائے امن سے تازہ کیا مغلوب کے دل کو
جوانمردوں کو امیّد و مسّرت کی نِشانی دی

مجھے یارب! سُرورِ نغمہ کا تحفہ عطا کردے!

•

"Guerdon"

by Sarojni Naidu.

قوم کے معمار

دولت وزر سے نہیں بنتی کوئی قوم عظیم
قوم توہوتی ہے اُس قوم کے لوگوں سے بلند
لوگ، جو عزّتِ نفس اور صداقت کے لئے
ڈالتے رہتے ہیں ادبارِ مصائب پہ کمند

جاگتے رہتے ہیں یہ لوگ جواں عزم کے ساتھ
دوسرے لوگ جب آرام سے سو جاتے ہیں
یہ ڈٹے رہتے ہیں میدانِ عمل میں پیہم
دوسرے جبکہ کہیں اور ہی کھو جاتے ہیں

یہ جوانمرد کہ جو قوم کی تعمیر کے جال
وقت کی گہری زمینوں میں بچھا دیتے ہیں
اور پھر قوم کی عظمت کے سُتونوں کو یہ لوگ
آسمانوں کی بلندی تک اُٹھا دیتے ہیں

•

"The Nation Builders"

by R.W . Emerson.

بیداری

جہاں ہو خوف سے آزاد ذہن اُنساں کا
جہاں ہر ایک کا سر فخر سے بلند رہے
جہاں نہ علم پہ عائد ہو کوئی پابندی
جہاں شعور کا کوئی بھی در نہ بند رہے
جہاں مقامی تعصّب کی تنگ دیواریں
کریں زمیں کو نہ تقسیم ٹکڑوں ٹکڑوں میں

جہاں اُبلتے ہوں الفاظ کے سبک چشمے
خلوصِ قلب کی گہرائیوں کے دامن سے
جہاں تدبّرِ انساں کی بے تکاں کاوِش
صداقتوں کو جِلا بخشے ذہنِ روشن سے

جہاں پہ عقل ودلائل کا چشمۂِ شفاف
نہ بھٹکے مُردہ عقائد کے ریگزاروں میں
جہاں ترقّیِ فکر و عمل کی راہبری
بدل دے خشک فضا کو نئی بہاروں میں

خُدایا! مجھ کو ہے درکار تیری غمخواری
مِرے وطن کو عطا کر شعورِ بیداری

•

"Let my Country awake"

by Rabindranath Tagore.

شاعر کا خواب

ایک شاعر کے ہونٹوں پہ سوتا تھا میں
خواب بُنتا ہُوا عاشقوں کی طرح
مہوشوں کی طرح، دلبروں کی طرح
اُس کی خوشبو میں سانسیں بھگوتا تھا میں

جس کو قابو ہے لمحوں کی آواز پر
اپنے زندہ تخیل کی پرواز پر
جس کو فانی سعادت کی خواہش نہیں
گُنگُناتا ہے جو روح کے ساز پر

فرضی بوسوں سے کرتا ہے تسکینِ جاں
ملتی ہے فرضی چہروں میں اُس کو اماں
پیچھا کرتی ہیں جو صورتیں دَم بہ دَم
بن کے اُس کے تصوّر کی پرچھائیاں

جھیل میں آفتابی چراغاں کی ضَو
دیکھتا رہتا ہے صبح سے شام تک
کھینچتا رہتاہے روشنی کے خطوط
چشمِ تخیئل سے روح کے جام تک

پِیلی پِیلی حسیں شہد کی مکھّیاں
رقص کرتی ہیں انگور کی بیل پر
ان کی جانب توجہّ بھی کرتا نہیں
دیکھتا ہی نہیں اُن کے مدّوجزر

ذہن اُس کا کہیں بھی ٹھہرتا نہیں
خواب اُس کا کہیں سے بھرتا نہیں

ہاں ! گمراں سے تخلیق کرتا ہے وہ
ایسی اک شکل جو زندہ انساں سے بھی
کچھ زیادہ صداقت کی تصویر ہو
اُس کے خوش رنگ خوابوں کی تعبیر ہو
جو حقیقت کے جلوے دکھاتی رہے
اَبدیّت کے پودے اُگاتی رہے

•

"Poet's Dream"

by Shelley.

موت کی دہشت

جب مجھے خوف ستائے گا کہ مر جاؤں گا میں
ٹوٹ کر شیشے کی مانند بکھر جاؤں گا میں
قبل اِس کے کہ جنوں نوکِ قلم سے وہ خیال
جو مِرے ذہن کے پردوں پہ عیاں ہوتے ہیں
قبل اِس کے کہ کروں جمع کتابوں میں وہ راز
جو فقط حرف کی صورت میں بیاں ہوتے ہیں
قبل اِس کے کہ حقائق کے دبستانوں کو
تازہ افکار، نئے رنگِ سخن سے بھر لوں
چھان کر ذوقِ تجسّس کے گلستانوں کو
فکر کی خوشبو کو لفظوں میں مقیّد کر لوں

رات کے تاروں بھرے چہرے کو جب دیکھتا ہوں
نظر آتی ہیں علاماتِ محبّت مجھ کو
ابر آلود نظاروں کے مجسّم سایئے
میرے افکار کے پردوں پہ عیاں ہوتے ہیں
اِن کی ضَو سے مِرے اشعار جواں ہوتے ہیں
یہ مِرے عہدِ گذشتہ کے نشاں ہوتے ہیں

سوچتا ہوں کہ میں باقی نہ رہوں گا اِکدن
اِن علامات کو شعروں میں سجانے کیلئے
ان کے سایوں کی بدلتی ہوئی تصویروں کو
فکر کے جادوئی ہاتھوں سے اُٹھانے کے لئے

جب میں محسوس کروں گا کہ کوئی لمحۂ خاص
وقت کا کوئی نظر ساز مجسّم سایہ
مُڑ کے اب دیکھ سکے گا نہ کبھی میری طرف
چکھ سکے گا نہ کبھی میرے تخیل کا مزہ

جب میں محسوس کروں گا کہ مِرا ذوق جمیل
کر سکے گا نہ محبّت کی کبھی عکاسی
جب میں محسوس کروں گا کہ مِرا جذبۂ شوق
کر نہ پائے گا مِرے حُسنِ نظر کی تکمیل

جا کے میں وسعتِ ہستی کے کسی دریا پر
تنِ تنہا کہیں ساحل پہ ٹھہر جاؤں گا
اور اُس وقت تلک ٹھہرا رہوں گا ساکت
جب یہ الفت کے، یہ جذبات کے سب عکسِ جمیل
ڈوب جائیں گے کہیں دور خلا میں جا کر

•

"The Terror of Death."

by Keats.

طلوعِ سحر

چلی تازہ ہَوا کی ایک رَو سطحِ سمندر سے
کہا اُس نے کہ "کہرے! چھوڑ دے اب راستہ میرا"
بڑھی پھر کشتیوں کی سمت اور یوں چیخ کر بولی
"اٹھو ملاّحو! اب بہر سفر تیاّر ہو جاؤ!
اُٹھا دو کشتیوں سے اپنے اپنے بادبانوں کو
کہ رخصت ہو چکے ہیں رات کے ظلمت فگن سائے"

لپک کر دور اُفتادہ زمینوں کی طرف چیخی:
"اٹھو خوابوں کے متوالو! اٹھو اب دن نکل آیا"
بڑھی پھر جنگلوں کی سمت اور چلاّ کے یوں بولی
"درختو! اپنے اپنے سبز پرچم تم بھی لہراؤ"

پرندے کے سُبک لپٹے پروں کو چھو کے یوں بولی
"پرندے ! اٹھ فضا میں اپنے میٹھے گیت مہکادے":
چلی پھر کھیتیوں کی سمت اور بولی کہ "اے مُرغے"
"بجادے بانگ کا اپنی بگل دن ہے نکلنے کو"

کہا سرگوشیوں میں اُس نے پھر یوں کشت زاروں سے
"جھکا دو بہرِ استقبال اپنے اپنے سرپودو"
بڑھی گھنٹے کے گُنبد کی طرف اور چیخ کر بولی:
"اٹھ اے گھنٹے ! طُلوعِ وقت کا اعلان کر تو بھی"
بھری صحنِ کلیسا میں پھر آکر آہِ سرد اُس نے
کہا "تم تو ابھی آرام سے لیٹے رہو یوں ہی"

•

"Day break"

by Keats.

انسانی موسم

جس طرح چار رُتیں ہوتی ہیں اِس دنیا میں
ذہنِ اِنساں میں بھی پلتے ہیں یہ چاروں موسم
پہلے نفسانی بہاروں کا سماں آتا ہے
جب ترو تازہ تصور کے شگفتہ جھونکے
لطف اندوزئیِ احساس کے در کھولتے ہیں
ذہن میں عیش پسندی کا نشہ گھولتے ہیں

اور پھر آتا ہے گرمی کا دہکتا موسم
اُس کو دیرینہ تعیّش کا خیال آتا ہے
مگر اُس عہدِ بہاراں کا خیالِ شیریں
کر نہیں سکتا اِرادے متزلزل اُس کے
اُس کا دل فطرتِ انسانی میں ڈھل جاتا ہے
اُس کا معیارِ نظر جیسے بدل جاتا ہے

کر کے وہ جذبۂ دل سے نئے عہد و پیماں
آسمانوں کی بلندی تک اُچھل جاتا ہے

قلبِ انسانی پہ پھر دورِ خزاں آتا ہے
مردِ قانع کی طرح صابر و شاکر ہو کر
بیٹھ جاتا ہے وہ تہہ کر کے خیالات کے پَر
تاکہ آرام سے پھر دیکھ سکے گہرے میں
اپنے ماضی کی پُر اسرار حسیں تصویریں
اپنی تقدیر کی دُھندلائی ہوئی تحریریں
جو گذرتی ہوئی آتی ہیں نظر سب اس کو
عُمر کی قوّتِ برداشت کی دہلیز کے پار
ڈالتا ہی نہیں وہ ان پہ توجّہ سے نظر
کرتا رہتا ہے گوارا فقط ان کے منظر

اُس کی دنیا میں پھر آجاتا ہے اِک موسمِ سرد
ماند پڑ جاتے ہیں سب حوصلے تنہائی میں
وہ سمجھ جاتا ہے دل ڈوب رہا ہے اُسکا
سرد ٹھٹھرے ہوئے جذبات کی گہرائی میں
اب تو وہ مادّی دنیا سے گذر جائے گا
اور ہوجائے گا گُم وقت کی پہنائی میں

•

"Human Seasons"

by Keats.

شاہین

دور اُفتادہ و سُنسان زمیں کا چہرہ
جب نئی صبح کی کِرنوں سے نِکھر جاتا ہے
بھینچ کر اپنے پروں کو وہ نئے عزم کیساتھ
غیر ہموار چٹانوں سے گُذر جاتا ہے
اپنے دیرینہ شبستانوں سے رخصت ہو کر
نیلگوں دنیا کے حلقے میں ٹھہر جاتا ہے
رینگتا ہے شکن آلود سمندر نیچے
اور وہ کوہ کی چوٹی پہ نظر آتا ہے
تاکتا رہتا ہے کچھ آہنی دیواروں سے
اور پھر برق کی مانند جھپٹ پڑتا ہے

•

" Eagle "

by L.Tennyson.

مَرثیہ

اے زمانے! اے جہانِ آب و گِل! اے زندگی!
تیرے قدموں کے نِشاں پر چل رہاہوں آج بھی
میں جہاں پہلے کھڑا تھا کانپتاہوں اب وہاں
کونِ لاکر دے گا مجھ کو تیری عظمت کے نِشاں؟
اب یہاں کوئی نہیں! کوئی نہیں !کوئی نہیں !

وہ مِرے عہدِ گذشتہ کے حسیں شام وسحر
کرتی تھی پرواز جب دل میں مسرّت کی کِرن
موسموں کے خشک و ترنے کردیاسب مُنتشَر
اب کہاں وہ خوش مزاجی! اب کہاں وہ بانکپن
سردی، گرمی اور بہاریں دے گئیں افسردگی
تھا کبھی افسردگی میں بھی سُرورِ زندگی
اب مگر کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں

•

"Threnor"

by Shelley

انگریزی منظومات کا منظوم ترجمہ کرنے
میں ارشد صدیقی نے شعریت کے ساتھ ساتھ
خیالات و احساسات کا ربط اور جذبات کا
تسلسل قائم رکھنے میں جو کمال دکھایا ہے اُس
کی خصوصیت یہ ہے کہ تخلیقی حُسن کو ترجمہ
میں گرنے نہیں دیا اور یہی ایک اچھے فن کار
کا کمال ہے۔

بھوپال ۱۹۵۷ء

ایم عرفان

مُدیر "آرٹ اینڈ کلچر" ــــ بھوپال
آرگنائزنگ سکریٹری۔ انجمن ترقی اُردو ھند
(مدھیہ پردیش)

میمبر انٹرنیشنل مُسلم اکادمی آف سائنس
لیٹرس اینڈ آرٹس ــ پولینڈ

- عکسِ خیال — انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے
- خواب زار — غزلیں، نظمیں، قطعات
- نوائے حرف — غزلیں
- نغمہ زار — غزلیات و رُباعیات
- طلوعِ سحر — آغازِ شاعری کا انتخاب کلام
- عنواناتِ درخشاں — موضوعاتی نظمیں، قطعات، رُباعیات
- پسِ عکسِ خیال — انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے

(زیرِ ترتیب)

- بساطِ فکر و نظر — رسمی منظوم تخلیقات
- عمل، ردِّ عمل — نثری مضامین و مقالات

مکتبۂ دانش کدہ، بھوپال